تھا۔ وقتاً فوقتاً ریاض قادر کے ساتھ بھی بیٹھے نظر آتے۔ جب کافی ہاؤس کا نگرا جڑا تو وہاں سے ہجرت کی اور ٹی ہاؤس میں آ کر ڈیرے ڈالے۔ اس وقت ٹی ہاؤس میں نئی لسانی تشکیلات کی تحریک چل رہی تھی۔ مگر شاعری میں نئی لسانی تشکیلات کو سمونے کی ساری ذمہ داری دو شاعروں نے سنبھال رکھی تھی۔ ظفر اقبال نے اور افتخار جالب نے۔ نواب ناطق کے ٹی ہاؤس میں آ جانے سے یار و اغیار نے حوصلہ کیا اور ان کی شاعری کو نئی لسانی تشکیلات کی نمائندہ شاعری کے طور پر سننا اور سنانا شروع کر دیا۔

نواب ناطق نے ایک اعلان کیا۔ میز پر مکا مار کر کہا کہ آئن سٹائن کو نہیں ماننا۔ کیوں نہیں مانتے۔ کوئی دلیل؟ بولے کہ نظریہ اضافیت پر میں نے بھی کہا ہے۔ عرض کرتا ہوں۔

آشنا ہم بھی بسیط کار انبائے فضا
مخل اندام خلل ہیں تخلیہ سے خام کے

کتنی واضح بات ہے۔ آئن سٹائن بلاوجہ بات کو الجھا دیتا ہے۔

میں نے پوچھا ''آپ اپنے بزرگ غالب کو تو مانتے ہیں نا۔''

بولے کہ ''مانتا ہوں۔ کیا خوب شعر کہا ہے

مقدور ہو تو خاک سے پوچھوں کہ اولیم
تو نے وہ گنجہائے گرانمایہ کیا کئے

میں نے ڈرتے ڈرتے عرض کیا کہ بعض نسخوں میں؟ اولئیم' لکھا ہے۔''

بولے کہ ''غلط لکھا ہے۔ یہ اولیم ہے۔ یعنی اولین۔ یعنی پہلا سوال۔ یعنی بنیادی سوال یہ ہے کہ.....''

پھر غالب کے رنگ میں غالب سے بڑھ کر جو انہوں نے شعر کہا تھا وہ سنایا

گل گل لالہ گلزار چمن گلفام سے جاڑا گلابی تھا
گل گلدستہ گل گلزار تھا رنگ گلابی رنگ گلشن کا

بس پھر چل پڑے۔

فضولیات زمانہ تری طرح ہم بھی
جو آ سکے نہ خیالوں میں خام لاتے ہیں

وہ کہ شاعر ہوا ہے اور فن کار
اب وہ ناطق نواب کیا ہوگا

زاہد خشک میکشاں سے ہے
تجھ کو مے نوش تر پکارتے ہیں

جو مل جائے شیطان مجھ کو کہیں بھی
کروں خوب اس کی میں ایسی کی تیسی

نواب ناطق سے جب نئے سماجی شعور اور ترقی پسند شاعری کا ذکر کیا جاتا تو بھڑک اٹھتے۔ کہتے کہ ''ہم سے سنو۔ کیسا کس کر ہم نے آج کے معاملات کو باندھا ہے۔

نہ نمبر ایک آتی ہے نہ نمبر دو ہی آتی ہے
بسوں نے ایسی بس کی ہے کہ بس توبہ بھلی بس سے

سنڈے کے رز منڈے یا رب منائیں گے ہم
کام ہر بہانے حیلے اپنا بنائیں گے ہم
چھٹی تو روز ہی ہے چھٹا فقط ہے اک دن
کام چھٹی کے روز کر کے چھٹا بڑھائیں گے

پروا نہیں ہے گر جیب ہو جائے ساری خالی
معشوق ناز نخرے سر پر اٹھائیں گے ہم

مگر مقطع تک پہنچتے پہنچتے نواب صاحب غم روزگار سے زقند لگا کر پھر غم عشق پر آ گئے

تکیہ پہ سر رکھ کر ناطق سوگیا یہ کہہ کر
یہ داستان عاشق کبھی پھر سنائیں گے ہم

کسی نے پوچھا ''فیض صاحب کے بارے میں کیا خیال ہے۔'' کہا کہ ''شریف آدمی ہے۔ میرا بہت مداح ہے۔''

افتخار جالب کے متعلق پوچھا تو کہا ''ہونہار نوجوان ہے۔ کئی مرتبہ کہا کہ میاں کچھ سناؤ۔ مگر وہ میرے سامنے سناتے ہوئے شرماتا ہے۔''

ٹی ہاؤس کے سارے بیرے نواب صاحب کے مداحین میں شامل تھے۔ الٰہی بخش بیرے نے فرمائش کی کہ نواب صاحب میرے لیے بھی کچھ کہہ دیں۔ نواب صاحب نے برجستہ کہا۔

بخش الٰہی بخش دے میرے الٰہی بخش کو
بھول جائے تا زمانہ سب پرانے نقش کو

کافی ہاؤس کے بیروں میں دو اپنی جگہ منفرد تھے۔ شرافت اور منشی۔ شرافت صاحب استاد۔ منشی صاحب ان کے شاگرد تھے۔ دونوں کو ریاض قادر اور ناصر سے ربط خاص تھا۔

شرافت سے میرا تعارف ناصر نے کرایا ''یہ انتظار حسین ہیں۔ ''امروز'' میں کام کرتے ہیں۔''

''اچھا تو عقیلہ خالہ آپ کا افسانہ ہے۔''

یہ افسانہ اسی مہینے ''ماہ نو'' میں چھپا تھا۔

میں نے رائے پوچھی تو مسکرائے اور پانی سامنے رکھ کر خاموش واپس چلے گئے۔

تھوڑی دیر بعد کافی لے کر آئے۔ پیالیاں چنتے ہوئے بولے ''انتظار صاحب' یہ جو آپ نے زبان لکھی ہے یہ ہمارے رامپور میں قصائنیاں بولتی تھیں۔ کبھی شریف زادیوں کی زبان بھی لکھ کر دکھایئے۔''

دوسرا پھیرا کیا تو بولے ''یہ جو آپ کے ''امروز'' کے پہلے صفحہ پر فیض صاحب کی نظم شائع ہوئی ہے ویسے تو اچھی ہے۔ مگر ان سے ایک گزارش کیجئے۔''

''کیا''

''یہی کہ نظم لکھنے کے بعد نظر ثانی کر لیا کریں تو بہت اچھا ہو۔''

''بہت اچھا''

''کبھی کبھی سقم رہ جاتا ہے۔''

جب انڈیا کافی ہاؤس ڈیلن کافی ہاؤس بن گیا تو شرافت صاحب یہاں سے اکھڑ لیے۔ کافی ہاؤس کے باہر مال روڈ کے فٹ پاتھ پر میری ان سے مڈھ بھیڑ ہوئی۔ بولے ''انتظار صاحب ہم جا رہے ہیں۔''

''کہاں''

''دلی کے کافی ہاؤس میں ہم نے اپنا تبادلہ کرا لیا۔''

''شرافت صاحب کیوں جا رہے ہیں آپ۔''

''انتظار صاحب' بات یہ ہے کہ لوگ تو اچھے ہیں۔ مگر یہاں ہمارا کلچر نہیں ہے۔''

شرافت کے جانے کے بعد ریاض قادر اور ناصر کو منشی پر قناعت کرنی پڑی۔ موصوف بھی خوب تھے۔ مگر استاد کی بات اور تھی۔

کافی ہاؤس کے متصل چائنیز لنچ ہوم تھا۔ دیوار سے دیوار ملی ہوئی۔ دروازے سے دروازہ بھڑا ہوا۔ چائنیز کو کافی ہاؤس کا ضمیمہ جانو۔ کافی ہاؤس کا چائنیز کے بغیر گزارا نہیں تھا۔ کافی ہاؤس میں فون نہیں تھا۔ سو ہر کافی ہاؤس والا فون کے سلسلہ میں چائنیز کا محتاج تھا۔ پھر کافی ہاؤس میں تو بس ڈرائی لنچ ہو سکتا تھا۔ اور رات کو وہ نو بجے کے لگ بھگ بند ہو جاتا تھا۔ سو کافی ہاؤس کے نشئی اپنا نشہ پورا کرنے کے لیے اس چائے خانے کے محتاج تھے۔ سو اگر چائنیز والوں سے پوچھا جاتا کہ آپ کے یہاں خاص بیٹھنے والے کون تھے تو وہ وہی نام گناتے جو کافی ہاؤس سے منسوب تھے۔ یہ 1981ء کا ذکر ہے۔ چائنیز کے ویران ہوتے نقشہ کو دیکھ کر میرا ماتھا ٹھنکا کہ کہیں اس ہمارے پرانے ٹھکانے کا بھی چل چلاؤ تو نہیں ہے۔ سو میں نے سوچا کہ کیا مضائقہ ہے کہ عبدالمجید صاحب سے جو یہاں کے مالک اور منیجر تھے ذرا تبادلہ خیال کر لیا جائے۔ کیا خبر ہے کہ کب یہ بساط الٹ جائے۔

جب یہاں بیٹھنے والوں کا ذکر آیا تو انہوں نے سب سے پہلے عبداللہ بٹ اور شورش کاشمیری کو یاد کیا۔ اور یہ دونوں نام کافی ہاؤس کے ساتھ بھی لازم و ملزوم ہو گئے تھے۔

''اور کون کون لوگ یہاں بیٹھتے تھے۔''

''حمید نظامی مرحوم' میر خلیل الرحمن' آقا بیدار بخت' شاکر علی' انور جلال شمزا' استاد امانت علی' سیف الدین سیف' ناصر کاظمی۔''

پرانے وقتوں کا بیرا حنیف ہماری باتیں سن رہا تھا۔ اس نے ٹھنڈا سانس بھرا ''بس جی ناصر صاحب بہت اچھے آدمی تھے۔ جب

وہ اور آپ لوگ یہاں پہ آیا کرتے تھے۔'' اس فقرے کے ساتھ ہی میرے ذہن نے بھولے بسرے دنوں میں زقند لگائی۔ گرمی کی دوپہر تو بالعموم یہیں گزرتی تھیں۔ سب ہی یاروں کو اس میں سہولت تھی۔ چائنیز کی بالائی منزل میں کتنے ہی خاموش گوشے تھے۔ کسی بھی گوشے میں بیٹھ کر ہمارے شیخ صلاح الدین بے تکان فلسفہ پر گفتگو کر سکتے تھے۔ ناصر فلسفہ پر اس گفتگو کے بیچ اطمینان سے سو سکتا تھا۔ حنیف رامے آنکھیں موند کر انگشت شہادت کو گھما کر ہوا میں عورت کا پیکر تراش سکتا تھا۔

مگر اب تو چائنیز کا ہر گوشہ ہی خاموش تھا۔ چائنیز کی گہما گہمی کافی ہاؤس اپنے ساتھ لے گیا۔ کافی ہاؤس بند ہوا تو اس کے باسی پھر اس کوچے ہی سے نکل گئے۔ کافی ہاؤس میں تالا پڑ گیا۔ چائنیز ویران ہو گیا۔

مگر پھر یوں ہوا کہ مبارک احمد نے جب اپنا ڈیڑھ اینٹ کا حلقہ ارباب ذوق الگ بنایا تو اس کے جلسے یہاں کرنے شروع کیے۔ میں نے کہا ''حمید صاحب ادیب تو ماشاء اللہ یہاں پھر جمع ہونے لگے ہیں۔ جمعہ کے جمعہ محفل سجاتے ہیں۔''

بولے ''وہ جو پہلے بیٹھتے تھے وہ قدوالے لوگ تھے۔'' پھر سوچ کر بولے ''کیا خبر ہے آگے چل کر یہ بھی قد نکال لیں۔''

''پرانے بیٹھنے والوں نے یہاں بیٹھنا کیوں چھوڑ دیا۔''

''بہت سے لوگ اونچے چلے گئے۔ پھر وہ یہاں کیسے بیٹھتے۔ آپ بھی تو ٹی ہاؤس اور چائنیز دونوں جگہیں چھوڑ کر لارڈز میں جا بیٹھے تھے۔''

''مگر ہم تو پھر واپس آ گئے تھے۔''

''ہاں مگر بعض لوگ واپس نہیں آئے۔''

''اب یہاں باقاعدگی سے بیٹھنے والے لوگ کون ہیں۔''

''ستم رسیدہ لوگ۔ ہارے ہوئے لوگ۔''

''مثلاً۔''

''مثلاً یہ کہ پی آئی اے کی یونین جو گروپ الیکشن ہار جاتا ہے وہ ہار کر یاں آ بیٹھتا ہے۔ جب اگلی بار الیکشن جیت لیتا ہے تو وہ چلا جاتا ہے۔ ان کی جگہ ہارے ہوئے لوگ آن بیٹھتے ہیں۔ آج کل یہاں پاپولیشن پلاننگ کے لوگ بیٹھتے ہیں۔''

مگر تھوڑے ہی دنوں بعد چائنیز لنچ ہوم خود ہار گیا۔ ویسے تو پہلے ہی ہارا ہوا نظر آتا تھا۔ مگر اب آخری گھڑی آن پہنچی تھی

''آخر اجاڑ دینا اس کا قرار پایا''

کافی ہاؤس پہلے ہی بند ہو چکا تھا۔ اب اس کا ہمزاد بھی بند ہو گیا۔ اور وہ جو سامنے سڑک کے پار ڈین ریستواں ہوا کرتا تھا اور تھوڑے عرصے ادیبوں کا اڈا بنا رہا تھا وہ بھی زمانہ ہوا بند ہو چکا تھا۔ کیا زمانہ تھا کہ ادیبوں کی طبعیت میں ان دنوں قرار نہیں تھا۔ ایک چائے خانے میں بیٹھے بیٹھے اکتائے۔ اٹھ کر دوسرے میں جا بیٹھے۔ دوسرے سے اکتائے' تیسرے میں جا کر چائے کا آرڈر دیا اور محفل جمالی۔ مگر زمانہ ظالم ہے۔ یہ کوچہ جو چائے خانوں کا کوچہ تھا اب ویران ہے۔ سب چائے خانے بند ہو گئے سوائے ایک کے۔

سو صاحبو یہ پاک ٹی ہاؤس ہے۔ وائی ایم سی اے کی عمارت کا عقبی گوشہ۔ مال روڈ کے متصل نیلا گنبد کے دہانے پر ایک مختصر سا اجڑا اجڑا چائے خانہ۔ شہر کے ادیبوں کا آخری اڈا۔

پاک ٹی ہاؤس آگے انڈیا ٹی ہاؤس تھا۔ پاکستان کے قیام کے بعد بھی اچھے خاصے دنوں تک انڈیا ٹی ہاؤس رہا۔ پھر ایک دن انڈیا ٹی ہاؤس کا بورڈ اتر گیا۔ پاک ٹی ہاؤس نیا نام رکھا گیا۔ نیا نام اسے راس آیا۔ پھر یہاں بیٹھنے والے ادیبوں کی نفری بڑھتی ہی چلی گئی۔ گورنمنٹ کالج اور پنجاب یونورسٹی سے قرب اپنی جگہ مگر زیادہ فیض اس نے حلقہ ارباب ذوق سے حاصل کیا۔ اتوار کی اتوار حلقہ کا جلسہ وائی ایم سی اے کے بورڈ روم میں۔ اس کے بعد چندے کی چائے ٹی ہاؤس میں۔ قیوم نظر' شیر محمد اختر' انجم رومانی' شہرت بخاری' ریاض احمد' اعجاز حسین بٹالوی' ضیاء جالندھری' امجد الطاف۔ کیا کیا دانہ حلقہ کی محفل سے اٹھ کر آتا اور یہاں چائے کی میز پر آ کر پھر سے رواں ہو جاتا۔ ہاں یہاں یوسف ظفر اور مختار صدیقی بھی تو دیکھے جاتے تھے۔ مگر انہیں تو پنڈی چلے جانا تھا۔

تو یہ ہوئے پاک ٹی ہاؤس کے پہلے آبادکار۔ اس کے بعد تو قافلے آتے ہی چلے گئے۔ خیر پہلے تو زیادہ تر اتوار کی شام ہی کو یہاں ادیب حلقہ کے بہانے نظر آتے تھے۔ مگر رفتہ رفتہ اس دن کی قید ختم ہوتی چلی گئی۔ اتوار کے سوا بھی یہاں ادیب وقت بے وقت دیکھے جانے لگے۔ اور جب ناصر کاظمی نے کافی ہاؤس میں ریاض قادر کی صحبت کو سلام کر کے یہاں بیٹھنا شروع کیا تو وقت اور دن کی سرے سے کوئی قید ہی نہ رہی۔ صبح کے وقت جھانکو تو ناصر کاظمی۔ دوپہر کو جاؤ تو ناصر کاظمی۔ شام کو رات کو جب بھی ٹی ہاؤس میں جس نے بھی جھانکا ناصر کاظمی کو موجود پایا۔ گرد یار اکٹھے ہیں۔ کوئی مداح' کوئی ہمعصر شاعر مداح بس ناصر کو سننا چاہتے ہیں۔ جو شاعر ہیں وہ ناصر کو سننے کے بہانے اپنی غزل بھی سنانے کے درپے ہیں۔

زمانہ بدلتا چلا جا رہا ہے۔ اس کا اندازہ اس سے لگاؤ کہ قیوم صاحب نے اب اپنے نیکر کو تیاگ دیا ہے اور بجلی کے محکمہ کو بھی۔ اب وہ پتلون پہنتے ہیں اور گورنمنٹ کالج میں پروفیسری کرتے ہیں۔ اردو پڑھاتے ہیں۔ گورنمنٹ کالج میں ان کے پہنچنے سے گورنمنٹ کالج اور ٹی ہاؤس کے درمیان ٹریفک بہت بڑھ گیا ہے۔ کیسا کیسا دانہ ان کے واسطے سے گورنمنٹ کالج سے نکل کر حلقہ میں اور پھر ٹی

ہاؤس میں پہنچا۔ گورنمنٹ کالج میں طالب علم ٹی ہاؤس میں آ کر ادیب۔ مگر جنہیں یہاں پہنچنا تھا وہ قیوم صاحب کے واسطے کے بغیر بھی یہاں پہنچ گئے۔ اس وقت گورنمنٹ کالج میں ادب کا چرچا بہت تھا۔ ویسے تو ان کی اپنی مجلس اقبال تھی۔ اور اس کی کیا پر رونق محفلیں ہوتی تھیں۔ مگر اولوالعزم طلباء کو یہ میدان اپنی تگاپو کے لیے چھوٹا نظر آتا تھا۔ وہ وہاں سے نکلتے اور ٹی ہاؤس کا رخ کرتے۔ مظفر علی سید ان دنوں گورنمنٹ کالج کے دانشور نمبر ایک کے طور پر جانا جاتا تھا۔ وہ کتابوں سے لدا پھندا ٹی ہاؤس میں داخل ہوا اور اپنے لشکریوں سمیت ناصر کاظمی کی میز پر آن براجا۔ اس کے لشکریوں میں اس وقت سب نے بڑھ کر غالب احمد اور شاہد حمید تھے۔ باقی حنیف رامے کو وہ ابھی گود میں کھلا رہا تھا۔ بعد میں اس نوجوان کو بھی ناصر کاظمی ہی کے حلقہ میں شامل ہونا تھا۔ مگر مظفر کو اس وقت یہ کب خبر تھی کہ ناصر کے حلقہ میں پہنچ کر حنیف کو ایک اور ہی مرشد میسر آ جائے گا اور پھر وہ مظفر کے رشد و ہدایت سے بے نیاز ہو جائے گا۔ ہاں ایک اور دانہ کسی اور سمت سے شاید مظفر ہی کے واسطے سے یا شہزاد احمد کے واسطے سے ٹی ہاؤس میں داخل ہوا۔ یہ احمد مشتاق تھا۔ اس نے بھی ناصر کاظمی کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔

پھر انجمن ترقی پسند مصنفین کی عمارت بیٹھ جانے کے بعد جو ادیب گھر سے بے گھر ہوئے اور ان کے اپنے کوچے میکلوڈ روڈ کی زمین ان پر تنگ ہو گئی تو ان میں سے کتنوں نے اس کوچے سے نکل کر ٹی ہاؤس میں پناہ لی۔ ان کی بھی یہاں جلدی ہی آبادکاری ہو گئی۔ احمد راہی یہاں ایسے رسے بسے جیسے شروع سے اسی کوچے کے باسی تھے۔ اے حمید کچھ اس رنگ سے یہاں آ کر آباد ہوئے کہ چائے کی میز سے اٹھ کر کاؤنٹر پہ جا کر کھڑے ہوئے اور کسٹمروں کے بل بنانے لگے۔ بات یہ تھی کہ اس زمانے میں ٹی ہاؤس کے جو منیجر تھے علیم صاحب وہ اپنے یہاں بیٹھنے والے کسی ادیب کو پریشان حال نہیں دیکھ سکتے تھے۔ پریشان حال آزاد منش ادیبوں کے ساتھ خصوصی رعایات برتی جاتی تھیں۔ اگر کوئی ادیب کاؤنٹر پر کھڑا بل بناتا نظر آتا تو اس سے یار یہی مطلب نکالتے تھے کہ ٹی ہاؤس اس ادیب کی کچھ مدد کرنا چاہتا ہے۔ اس قسم کا فریضہ یہاں چند دنوں کے لئے انور جلال شمزا نے بھی انجام دیا تھا۔

ٹی ہاؤس شروع ہی سے اس قسم کا چائے خانہ چلا آتا ہے جو ہر چند کہ مال روڈ کے نکڑ پہ آباد ہے۔ مگر مال روڈ کے ریستوراں والے تکلفات یہاں کبھی نہیں دیکھے گئے۔ اور ڈنر اور لنچ پہ نیپکن کا اہتمام' یہ تو یہاں تصور ہی نہیں کیا جا سکتا۔ مگر اعجاز حسین بٹالوی لنچ کے اوقات میں ہائیکورٹ سے نکل کر یہاں پہنچتے۔ کھانے کا آرڈر دیتے۔ بابو بیرا پہلے ایک نیپکن لے کر حاضر ہوتا۔ پھر کھانا سرو کرتا۔

سوئے اتفاق سے انہیں اوقات میں احمد مشتاق اپنے چارٹرڈ بینک سے نکل کر یہاں آتا اور کھانا کھاتا۔ وہ کتنے دنوں تک اپنی میز سے یہ منظر دیکھتا رہا کہ بابو کھانا لگانے سے پہلے بڑے اہتمام سے ان کے لیے نیپکن لے کر آتا ہے۔ یہ منظر دیکھ کر اس کا خون

کھولتا رہا۔ ایک دوپہر کو یہ ہوا کہ اس نے میز پر بیٹھتے ہی بابو کو آواز دی۔ کھانے کا آرڈر دیا۔ کھانا آیا تو کہا۔ ''نیپکن کہاں ہے؟ نیپکن لے آؤ۔''

بابو حیرت سے احمد مشتاق کا منہ تکنے لگا۔ ''نیپکن؟''

''ہاں نیپکن'' مشتاق نے آواز میں زور پیدا کر کے کہا۔

''مشتاق صاحب جی' نیپکن تو نہیں ہے۔''

''ہے کیسے نہیں۔ جاؤ نیپکن لے کے آؤ۔''

بابو حیران و پریشان کاؤنٹر پہ پہنچا اور سراج صاحب سے کہا ''مشتاق صاحب جی نیپکن مانگ رہے ہیں۔''

''نیپکن مانگ رہے ہیں؟ اچھا!''

سراج صاحب آدمی شناس تھے۔ اپنے یہاں بیٹھنے والے ادیبوں کے مزاجوں کو خوب سمجھتے تھے۔ فوراً ہی بات کی تہہ تک پہنچ گئے۔ اٹھ کر مشتاق کی میز پر گئے ''مشتاق صاحب' آپ کو پتہ ہے کہ ٹی ہاؤس میں ہم نے نیپکن کا اہتمام کبھی نہیں کیا۔''

''پھر یہ اعجاز صاحب کے لیے خصوصی اہتمام کیوں ہے۔''

''وہ اعجاز صاحب کا اپنا انتظام ہے ہمارا اس نیپکن سے کوئی تعلق نہیں ہے۔''

مگر مشتاق اس جواب سے مطمئن نہیں ہوا۔ اس نے کھانے کا آرڈر منسوخ کیا اور بھوکا واپس بینک چلا گیا۔

پتہ نہیں بعد میں اس نیپکن کا کیا ہوا۔ اعجاز صاحب نے تو بھٹو صاحب کا مقدمہ ہاتھ میں لینے کے بعد ٹی ہاؤس آنا چھوڑ دیا تھا۔

ارے یہ تو میں بہت آگے کے زمانے میں نکل آیا۔ میں تو ابھی ٹی ہاؤس کے دور اول کو یاد کر رہا تھا۔ اس وقت ٹی ہاؤس میں تین شاعروں کا دور دورہ تھا۔ ایک تو قیوم نظر آتے تھے۔ ٹی ہاؤس میں داخل ہو کر پہلے کاؤنٹر پہ کھڑے ہوتے اور کسی نہ کسی بہانے قہقہہ لگاتے۔ ایسا قہقہہ کہ پورے ٹی ہاؤس کو پتہ چل جاتا کہ قیوم صاحب آ گئے ہیں۔

دوسرا شاعر ناصر تھا۔ اس کی امت میں اضافہ ہوتا چلا جا رہا تھا۔ اور قیوم صاحب کی تشویش بڑھتی چلی جا رہی تھی۔

تیسرا شاعر باہر سائیکل سٹینڈ پر کھڑا تھا۔ میں ان دنوں سائیکل پہ آتا جاتا تھا۔ اور سائیکل کو ٹی ہاؤس کے سٹینڈ پر رکھ کر ناصر کے ساتھ پیادہ پائی کے چکر میں ایسا بھولتا تھا کہ اکثر اوقات بالا ہی بالا گھر کی طرف ہو لیتا۔ یہ بیدل جالندھری کا فرض تھا کہ وہ میری سائیکل کا خیال رکھے اور اگر میں رات کو وہیں چھوڑ دوں تو وہ اسے اندر سنبھال کر رکھے۔ بیدل جالندھری منحنی سا نوجوان تھا۔ سانولی

رنگت' پستہ قد' خاموش طبیعت۔ شعر کہتا تھا اور اکثر مجھے سناتا تھا اور داد پاتا تھا۔ اب میں روزنامہ ''آفاق'' سے منسلک ہو چکا تھا۔ ایک دن کالم میں میں نے ناصر کی غزل کا ذکر کیا۔ شام کو ٹی ہاؤس پہنچا تو دیکھا کہ بیدل جالندھری کے تیور بگڑے ہوئے تھے۔ سیدھے منہ بات نہیں کر رہا۔ میں نے مزاج پوچھا تو بگڑے لہجہ میں بولا ''انتظار صاحب' آپ کو پتہ ہے کہ میں ناصر صاحب سے اچھی غزل کہتا ہوں۔ آپ نے اخبار میں میری غزل کا تو کبھی ذکر نہ کیا۔ ناصر صاحب کی ایسی کمزور غزل کی اتنی تعریف کر ڈالی۔''

میں نے بیدل جالندھری کی بہت للو چپو کی۔ لیکن دل سو شیشے سے نازک' دل سے نازک خوئے دوست۔ بیدل کا دل ٹوٹ گیا تھا۔ اسے مجھ سے جو شکایت پیدا ہو گئی تھی وہ پھر کسی طور دور نہیں ہوئی۔ ویسے اور دوستوں کو بھی کچھ اسی قسم کی شکایت پیدا ہوئی تھی۔ خاص طور پر ناصر کے اس خاکہ کے بعد جو انہیں دنوں ''نقوش'' میں چھپا تھا۔ اور تب مجھے احساس ہوا کہ ٹی ہاؤس میں سب اچھا نہیں ہے۔ یوں گھل مل کر بیٹھتے ہیں۔ شعر سنتے ہیں سناتے ہیں۔ داد دیتے ہیں' داد پاتے ہیں۔ مگر در پردہ رقابتیں بھی چل رہی ہیں۔

شعر سننے سنانے کی صورت یہ تھی کہ ادھر ناصر نے سگریٹ سلگانے کے بعد چائے کا گھونٹ لیا' ادھر کسی نے سوال داغا ''ناصر صاحب' کوئی تازہ غزل ہوئی۔''

ان دنوں ناصر کی طبیعت مستقل رواں رہتی تھی۔ اطمینان سے گھر بیٹھیں تو قلم کاغذ سنبھالیں اور غزل قلمبند کریں۔ جب طور یہ ہو کہ ابھی کافی ہاؤس میں بیٹھے ہیں۔ وہاں سے اٹھے تو چائنیز میں چائنیز سے نکلے تو ٹی ہاؤس میں۔ اس عالم میں یہی ہونا تھا کہ شعر وارد ہو رہے ہیں اور انہیں سگریٹ کی ڈبیا پھاڑ کر الٹی طرف لکھا جا رہا ہے۔ جیب میں ڈبیوں کے ٹکڑے اور پنی پر سے اتارے ہوئے کاغذ بھرے رہتے تھے۔ فرمائش پر یہ پرزے جیب سے نکلتے اور غزل سنائی جاتی۔ پھر اللہ دے اور بندہ لے۔ پتہ چلتا کہ اس عاجز کے سوا سب ہی شاعر ہیں۔

شعر سننا سنانا تو ہوا۔ مگر ان دنوں ایک اور مشغلہ زوروں پر تھا۔ کیسا کیسا فاضل اجل ٹی ہاؤس میں بیٹھا ہوا تھا۔ مظفر بغل میں اتنی کتابیں داب کے لاتا تھا کہ اس کا پاؤں بھاری رہنے لگا تھا۔ پھر شیخ صلاح الدین جو خود بہت بھاری تھے۔ کتابوں کے بوجھ نے انہیں مزید بھاری بنا دیا تھا۔ زبان میں تھوڑی لکنت تھی۔ لیکن فلسفہ کے موضوعات پر کس روانی سے بولتے تھے۔ فلسفہ تو یوں سمجھو کہ ان کے گھر کی لونڈی تھی۔ اس لونڈی کو وہ ہماری مالکن بنانے کے درپے تھے۔ انہیں ہمارے حال پہ بہت افسوس ہوتا تھا کہ ہم ادب کے الجھیڑے میں اپنی عمر ضائع کر رہے ہیں۔ فلسفہ سے بے بہرہ ہیں۔ ویسے میں نے تو صاف لفظوں میں اپنی جہالت کا اعتراف کر لیا تھا ''شیخ صاحب فلسفہ کا مضمون آپ کا ہے۔ میں فلسفہ کے نام صفر ہوں۔ یہ مضمون میری سمجھ سے باہر ہے۔''

''کیسے باہر ہے۔'' اور انہوں نے دوسرے ہی دن وائٹ ہیڈ کا ایک لیکچر میرے حوالے کیا ''اسے پڑھو۔''

اسے پڑھ کر میرا وہ حال ہوا جیسے کوئی دیہاتی شہر میں آ کر پہلی مرتبہ فلم دیکھے اور مبہوت رہ جائے۔ میں نے ایک سانس میں وائٹ ہیڈ کی کئی کتابیں پڑھ ڈالیں۔ شیخ صاحب میری پروگریس پہ بہت خوش تھے۔ ادھر ناصر نے احمد مشتاق کے ایک شعر میں تھیلی کا فلسفہ دریافت کر کے یاروں کو حیران کر دیا۔ شیخ صاحب کو اس پر کوئی حیرانی نہیں ہوئی۔ مگر اسے خالی اپنے درس کا کمال نہیں جانتے تھے۔ ناصر کے متعلق ان کا خیال تھا کہ گھنا آدمی ہے۔ بہت سا علم اپنے اندر چھپائے بیٹھا ہے۔ جیسے پرانے زمانے میں بڑے صوفیا کا طریق تھا کہ اپنی ذات میں علم باطنی کا سمندر ہیں مگر گلی کے نکڑ پر بیٹھے جوتیاں گانٹھ رہے ہیں۔ یہ ظاہر کرنے کے لیے کہ وہ نرے موچی ہیں۔ ناصر کی شاعری کا مشغلہ شیخ صاحب کی نظروں میں کچھ اسی قسم کا کاروبار تھا۔

خیر جلدی ہی ہماری منڈلی میں ایک ایسا نوجوان آ گیا جس نے فلسفہ کا بار امانت سارے کا سارا اپنے کندھوں پر اٹھا لیا۔ شیخ صاحب ایسے ہی کندھوں کی تلاش میں تھے۔ اب سے پہلے میں نے اس نوجوان کو اس رنگ سے دیکھا تھا کہ مال روڈ کے فٹ پاتھ پر ایک پیپل کے درخت کے تنے سے کمر لگائے کھڑا ہے۔ نظریں سامنے سڑک پر گزرتی سائیکل سوار لڑکیوں پر جمی ہیں۔ پھر خلا میں تکنے لگتی ہیں۔ پھر انگشت شہادت بلند کر کے اس طرح گردش دیتا ہے جیسے ہوا کے کینوس پر نسوانی پیکر بنا رہا ہے۔ اس کا نام حنیف تھا۔ جلدی ہی اس نام کے ساتھ اس نے رامے کا لاحقہ جوڑ لیا۔

حنیف رامے ویسے تو ایک نئے مصور کے طور پر ابھر کر سامنے آیا تھا مگر ہماری منڈلی میں آ کر اسے جلدی ہی شیخ صاحب کی نگرانی میں فلسفہ کی ذمہ داریاں بھی سنبھالنی پڑیں۔ یہ مظفر علی سید کے حقوق اور اختیارات پر ڈاکہ زنی کے واردات تھی۔ آخر مظفر کے ناخنوں میں بھی تو علم بھرا پڑا تھا۔ یہ علم بھی نئے سینوں اور نئے دماغوں میں منتقل ہونے کے لیے بیتاب تھا۔ یوں گورنمنٹ کالج کے ذہین نوجوان وہ جنہیں مصوری شاعری یا کسی بھی فن سے شغف تھا مظفر کو اپنا مرشد مانتے تھے۔ مگر مرشد ہر مرید پر تکیہ نہیں کر سکتا تھا۔ ایسے تو گنے چنے تھے جو مرشد کی تربیت سے فیض یاب ہو کر بار امانت اٹھانے کے متحمل ہو سکتے تھے۔ مگر ان سالکوں کی نظریں اب کہیں اور تھیں۔ غالب احمد پہلے ہی شیخ صاحب کے ہاتھ پہ بیعت کر چکا تھا۔ اب حنیف رامے نے بھی مظفر سے منہ موڑا اور شیخ صاحب کو اپنا مرشد بنا لیا۔

رہ گیا احمد مشتاق۔ اس ابھرتے شاعر سے بھی مظفر نے بہت امیدیں وابستہ کی تھیں۔ اور شاید مشتاق جو اتنے سوز سے میرا بائی کے بھجن گا کر ہمارے رتجگوں میں اداسی کا رنگ بھر دیتا تھا وہ مظفر ہی کی تربیت کا فیض تھا۔ کیونکہ اصل میں تو مظفر ہی نے ہم سب کو بچی

شاعری کے درشن کرانے کے خیال سے میرا کے بھجنوں کا اردو رسم الخط میں ایک مسودہ تیار تھا۔ حق یہ ہے کہ ہم سب ہی نے اس مسودے سے بھرپور استفادہ کیا۔ اسی کے زیر اثر ہمارے درمیان فلم ''جوگن'' نے مقبولیت حاصل کی جسے ہم نے میٹنی شو میں جا کر بار بار دیکھا۔ ویسے مظفر نے غزلیں بھی لکھی ہیں۔ اب تک لکھ رہا ہے لیکن مجھ سے پوچھو تو شاعر وہ ان بھجنوں اور دوہوں ہی میں نظر آتا ہے جو اس نے ان دنوں لکھے تھے۔ یہ بے قرار روح اس صنف میں تھوڑا ٹک جاتی تو آج ہمیں دوہے کے لیے خالی جمیل الدین عالی پہ قناعت نہ کرنی پڑتی۔

قرار مظفر کے یہاں ہمیشہ بس حصول علم کی حد تک رہا۔ آگے تو بے قراری ہی بے قراری ہے۔ یار عزیز منصوبہ بندی غضب کی کرتا تھا۔ قلم بعد میں اٹھاتا پہلے ایک جامع منصوبہ بناتا۔ مگر قلم چلتے چلتے زقند لگا کر کسی نئے منصوبے کی طرف چل پڑتا اور یہ منصوبہ اپنی تکمیل کے لیے ترستا رہ جاتا۔ ہزاروں منصوبے ایسے کہ ہر منصوبے پہ دم نکلے۔ تکمیل کی شرمندگی کسی منصوبے کو آج تک نہیں اٹھانی پڑی۔ مظفر اپنے منصوبوں سے وفا نہیں کرتا۔ مظفر سے اس کے چیلے وفا نہیں کرتے۔ عشق کر کے بھی دیکھ لیے۔ مگر عشق بھی سارے تشنہ تکمیل ہی رہے۔ ہاں یہ ہے کہ پچاس فیصدی کی حد تک مراحل یقیناً طے ہو جاتے تھے۔ باقی رہا بقیہ پچاس فیصدی کا معاملہ تو وہ مراحل اپنی تکمیل کے لیے فریق ثانی کی توجہ کے محتاج ہوتے تھے۔ سو سارے عشق پچاس فیصدی کی حد تک بھرپور و بقیہ پچاس فیصدی بے مہری یار کی دلخراش داستان۔ جب ہی تو طبیعت میں وہ گداز پیدا ہوا کہ ہر اچھا شعر ان دنوں دل پہ تیر کی طرح جا کر لگتا تھا اور مظفر تڑپ کر داد دیتا تھا۔ خصوصاً مشتاق کے شعروں پر پ مگر مشتاق کی آنکھ بھی طوطے کی آنکھ نکلی۔ یہ نگ شیخ صاحب نہ جیت سکے تو کیا ہوا۔ اسے ناصر نے سنگوالیا۔ ادھر بہر حال محرومی مقسوم ٹھہری تھی۔ ایک تو آدھی رات کا جادو۔ اوپر سے مشتاق کے شعروں کا سوز و گداز۔ مظفر نے داد کے جوش میں مشتاق کا ہاتھ تھام لیا۔ اور مشتاق نے محسوس کیا کہ اس کی ہتھیلی پر کوئی گرم شے گری ہے۔ یہ مظفر کا آنسو تھا۔ شعر پر اس سے بڑی داد کیا ہو سکتی تھی۔ مگر

''نہ لادے تاب جو غم کی وہ میرا راز داں کیوں ہو''

مشتاق اس داد کی تاب نہ لا سکا۔ اگلے دن یہ آنسو دوستوں کے درمیان افسانہ بن چکا تھا۔ باقی یہ یاد نہیں کہ ناصر نے یہ شعر اس واقعہ سے پہلے لکھا تھا یا بعد میں۔

واقعہ یہ ہے کہ بدنام ہوئے
بات اتنی تھی کہ آنسو نکلا

یہ ہمارے رتجگوں کا زمانہ تھا۔ میں ہوں رات کا ایک بجا ہے۔ ٹی ہاؤس سے تو گیارہ بجے ہی اٹھ لیے تھے۔ اس کی بساط تو بس اتنی ہی تھی۔ حد سے حد ساڑھے گیارہ بجے۔ رتجگا کرنا ہے تو کوئی اور ٹھکانا ڈھونڈو۔ وہ اور ٹھکانا ایک وقت میں میٹرو ہوٹل تھا۔ گرمیوں کے دن ہیں۔ کھلے آسمان کے نیچے میزیں سجی ہیں۔ درمیان میں فلور ہے۔ بال روم ڈانسنگ کا اہتمام ہے۔ رات بھیگ چلی ہے۔ رقص کرتے جوڑوں پر سپردگی کی کیفیت طاری ہے۔ شیخ صلاح الدین ان سے بے پروا وقت کے موضوع پر جاری ہیں۔ بتا رہے ہیں کہ وقت ہندو فلسفہ میں دائرہ ہے۔ اسلامی تصور میں وہ زینہ پیچاں ہے۔

''زینہ پیچاں۔ یہ کیا چیز ہوتی ہے۔''

''Spiral-'' شیخ صاحب سمجھاتے ہیں'' اردو میں اس کے لیے کوئی لفظ نہیں ہے۔ میں نے اس کا ترجمہ زینہ پیچاں کیا ہے۔''

اے لو ادھر ہم رقص جوڑے رخصت ہو گئے۔ موسیقی کی گت بدل گئی۔ روشنی کا رنگ بھی کچھ سے کچھ ہو گیا۔ اب ہم اندھیرے میں ہیں۔ یعنی سب ہی ارد گرد بیٹھے لوگ۔ بس فلور پر روشنی کا ایک تھالا سا بنا نظر آ رہا ہے۔ اینجلا اپنے مختصر لباس میں چھم چھم کرتی نمودار ہوتی ہے۔ اچھا آج تو کیبرے کا دن تھا۔ وقت کا سارا فلسفہ پس منظر میں چلا گیا۔ کم از کم میرے لیے کہ میری نظریں اب اینجلا پر مرکوز ہیں۔ مگر شیخ صاحب اسی جوش سے جاری ہیں۔ اور یار ہمہ تن گوش بنے ہوئے ہیں۔ شیخ صاحب کو اسی لیے تو میٹرو میں بیٹھنا پسند ہے۔ ٹی ہاؤس میں ادبی گنوردل کے بیچ وہ کسی بھی فلسفہ کے مسئلہ پر اتنی یکسوئی کے ساتھ کہاں غور و فکر کر سکتے ہیں۔ لاکھ ہماری ٹیبل سب سے الگ ہو۔ مگر کوئی بھی کسی گھڑی آن دھمکتا ہے۔ فلسفیانہ فکر میں کھنڈت ڈال دیتا ہے۔ یہاں اینجلا کے سوا کسی طرف سے کھنڈت نہیں پڑتی۔ مگر شیخ صاحب کے لیے تو اینجلا کا وجود و عدم برابر ہے۔

لاہور میں اس وقت جو دو تین اونچے درجہ کے ہوٹل تھے ایک ان میں میٹرو تھا۔ اور شاید اینجلا کے زور پر کچھ زیادہ یہ زور میں جا رہا تھا۔ اور یہ دیکھو کہ ہماری ٹولی اپنی محدود بہت ہی محدود آمدنیوں کے باوجود اور ٹی ہاؤس کی فضول خرچی کے باوصف یہاں بیٹھنے کی بھی عیاشی کر لیتی تھی۔ بلکہ جب کرسمس نائٹ اور نیو ایئر نائٹ پر ٹکٹ کے ذریعہ داخلہ ہوتا تھا تو پہلے سے ٹکٹ خرید کر نشستیں محفوظ کرا لیتے تھے۔

میٹرو کے بڑے ہال کے دروازے پر دائیں بائیں دو قد آدم برہنہ نسوانی مجسمے کھڑے تھے۔ جب شہر میں مولویوں کی طرف سے فاشی فاشی کا شور اٹھتا تھا تو ان مجسموں کا تن الٹا سیدھا ڈھانک دیا جاتا تھا۔ جب شور تھم جاتا پھر وہ تن ننگے ہو جاتے۔ پھر جب کبھی شور مچتا پھر اسی رنگ سے تن پوشی ہو جاتی۔ بال روم ڈانسنگ ساتوں دن۔ کیبرے کے لیے ایک تو اتوار کی رات مخصوص تھی۔ کوئی ایک

رات ہفتے کے بیچ۔ دوراتیں دھوم سے منائی جاتی تھیں۔ کرسمس کی رات اور نئے سال کی رات۔ پینے پلانے پر پابندی لگ گئی تو پھر دخت رز نے قالب بدل لیا۔ بوتل کی جگہ کیتلی نے سنبھال لی۔ چائے کی پیالی ساغر بن گئی۔

گرمیاں شروع ہونے پر شام پڑے اندر کی رونق باہر آ جاتی۔ رقص آسمان تلے ہوتا۔ رات جوں جوں بھیگتی توں توں محفل رنگ پکڑتی جاتی۔ اور اینجلا جب چھم چھم کرتی نمودار ہوتی تو تھوڑی ہی دیر میں ایک صندلی بلی نمودار ہوتی اور فلور پر پہنچ کر اینجلا کو دیکھتی اور محو حیرت ہو جاتی۔ کوئی ویٹر آ کر اسے دھتکارتا۔ وہ اطمینان سے فلور سے منہ موڑ کر آہستہ آہستہ چل کر اس میز تلے جا بیٹھتی جو کسٹمرز سے ذرا ہٹ کر ہوٹل کے منیجر کے لیے مخصوص تھی۔ منیجر کے ساتھ ایک اور صاحب بیٹھے نظر آتے۔ یوں جوان تھے مگر سر سارا سفید تھا۔ یہ برنی صاحب تھے۔ انصار کے دوست۔

''ماموں' ناصر کاظمی کی شاعری تمہیں کچھ نہیں دے گی۔ ہمارے پاس بیٹھو۔ اینجلا فارغ ہو جائے۔ اس سے ملواتے ہیں۔ اللہ قسم بہت کمال کی عورت ہے۔ خوش ہو جاؤ گے۔''

بس آتے جاتے میں اسی طرح پکڑا جاتا تھا۔

''ملیں گے کسی وقت۔'' میں ٹالتا اور اپنی میز کی طرف جانے لگتا۔

''انصار کا ماموں اور اتنا خشک۔ حد کر دی تم نے ماموں۔'' برنی صاحب ٹھٹھا لگاتے۔

لیجئے اب تین بج رہے ہیں۔ اینجلا اپنا آخری جلوہ دکھا چکی۔ میٹرو کی محفل اجڑنے لگی ہے۔ بیرے بل پلیٹ میں رکھ رکھ کر ہر میز کی طرف لپک جھپک جا رہے ہیں۔ مطلب یہ کہ بل ادا کرو اور اپنا رستہ پکڑو۔ ہم بھی اپنا رستہ پکڑتے ہیں۔

باہر نکل آئے ہیں۔ اب کیا کیا جائے۔

''اب گھر چلنا چاہیے۔''

''گھر؟'' ناصر برہمی سے مجھے دیکھتا ہے ''اب تو میری آنکھیں کھلنی شروع ہوئی ہیں۔''

''چائے اب کہاں ملے گی؟''

''لوہاری میں مل سکتی ہے۔''

لیجئے ہم لوہاری دروازے کی طرف چل پڑتے ہیں۔ لوہاری دروازہ۔ پرانے شہر کے مشہور دروازوں میں سے ایک دروازہ۔ بھاٹی دروازے کی اپنی رونق ہے۔ موچی دروازے کی اپنی رونق ہے۔ مگر ہم لوہاری دروازے سے مانوس ہیں۔ تاریک اور نیم

تاریک رستوں سے گزرتے لوہاری کی طرف چلتے ہیں۔ سڑک کے کنارے ایک پان والا نظر آتا ہے۔ ناصر کو یہاں پڑاؤ کرنا ضرور ہے۔ رات کے تنبولیوں سے ناصر کی خوب ٹپتی ہے۔ ادھار بھی چلتا ہے۔ اور لیجئے اس تنبولی کے برابر یہ خستہ حال بابا بیٹھا ہے۔ سامنے ایک میلا سا رومال بچھا ہے۔ اس پر بہت ساری ماچس کی خالی ڈبیاں رکھی ہیں۔ انہیں کھڑا کر کے ترتیب سے کھڑا کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔

''بابا' یہ کیا ہے'' ناصر منہ میں پان رکھتے رکھتے پوچھتا ہے۔

''یہ خالی بستیاں ہیں۔ خالی اجڑی بستیاں۔'' اور پھر اپنے کام میں منہمک ہو جاتا ہے۔

''ٹھیک کہتا ہے۔ خالی بستیاں۔'' ناصر اداس ہو جاتا ہے۔ اور ہم آگے چل پڑتے ہیں۔

لوہاری دروازے پر انارکلی کے نکڑ پہ ایک خستہ حال چائے کی دکان ہے۔ یہاں رات بھر کڑک چائے چلتی ہے۔ اندر ایک ٹوٹی پھوٹی بنچ۔ ایک لمبی سی میز۔ کڑک چائے آ گئی۔ اور ناصر کی آنکھیں اب کھل چکی ہیں۔ میٹرو میں بیٹھ کر فلسفہ سنا۔ اب شاعر کی باری ہے۔

ناصر کا بیان جاری رہتا ہے اس وقت تک جس وقت تک چڑیاں نہیں بولتیں۔ چڑیوں کی چہکار سنائی دی اور ناصر چپ۔ اب اس کی آنکھوں میں نیند اترنی شروع ہوتی ہے۔ لو صاحبو' صبح ہونے لگی ہے۔ ہمارا رتجگا ختم۔ گھر چل کر جتنی گھڑی آرام کر سکتے ہیں کر لیں۔ دوپہر ہوتے ہوتے شاید پھر ٹی ہاؤس میں ملیں۔

◆◆◆

بے خانماں کی خانہ آبادی

نہ دن کو چین نہ رات کو آرام۔ پچھلے پہر گھر پہنچ گئے تو تھوڑا سو لیے۔ گھر نہیں گئے اور پیٹھ لگانے کا وقت نہیں ملا تو بھی کیا ہوا۔ سونا ایسا کونسا ضروری کام ہے۔ سوئے سوئے نہ سوئے۔ اور سونے کے لیے گھر جانا کیا ضروری ہے۔ کم از کم ان دنوں تو یہ مطلق ضروری نہیں تھا۔ ایک دن جانے کیا کام آ پڑا میں صبح سویرے گھر سے نکل پڑا۔ چلتے چلتے چائنیز میں جھانکا تو دیکھا کہ ریستوراں خالی ہے۔ بیرے جھاڑ پونچھ میں مصروف ہیں۔ ناصر کاندھے پہ تولیہ ڈالے باتھ روم کی طرف جا رہا ہے۔ پتہ چلا کہ رات چائنیز ہی میں بسر ہوئی تھی۔ مگر یہ ان دنوں کا ذکر ہے جب میں رتجگے کا زیادہ قائل نہیں تھا۔ رات جب بھیگنے لگتی تو محفل کو جما چھوڑ' اٹھ کھڑا ہوتا اور گھر کی راہ لیتا۔ مگر آخر کب تک۔ رتجگوں کا جادو چڑھتا چلا جا رہا تھا اور میری قوت مزاحمت ڈھیتی چلی جا رہی تھی۔

خیر ہمارے تو جیسے کیسے گھر موجود تھے۔ بیٹھنے سونے کا ٹھکانا تھا۔ گھروں میں ہنڈیا ڈوئی توے چولہے کا کھڑاک بھی پھیلا ہوا تھا۔ مگر ناصر تو اس سارے کاروبار سے بے نیاز تھا۔ پرانی انارکلی میں جو گھر تھا وہ تو سوتیلے بڑے بھائی کے تصرف میں تھا۔ ایک تنگ و تاریک کمرہ ناصر کو دے رکھا تھا۔ اس کمرے میں ایسا کونسا آرام کا سامان تھا کہ ناصر کے یہاں اس کے لئے کوئی کشش ہوتی۔ صبح پو پھٹے منہ ادھر اٹھ گیا تو جا کر کمر لگالی۔ باقی سونے کا کیا تھا۔ وہ تو کہیں بھی سویا جا سکتا تھا۔ ناصر کے لیے سونے کا سب سے مناسب وقت وہ تھا جب دوپہر کو یار چائنیز کی بالائی منزل میں اکٹھے ہوتے اور شیخ صاحب گمبھیر مسائل پر گفتگو شروع کرتے۔ ویسے تو ان اوقات میں بھی ادبی مخلوق ٹی ہاؤس میں منڈلاتی رہتی تھی۔ ادبی مخلوق پر موقوف نہیں تھا۔ دانشوروں کی جملہ اقسام بھی تو تھیں جو کافی ہاؤس میں ڈیرہ ڈالے پڑی رہتی تھیں۔ ناصر کی ہر حلقہ میں مانگ تھی۔ سو اسے سب سے آنکھ بچا کر چائنیز کی بالائی منزل میں پہنچنا ہوتا تھا۔ یہاں گنے چنے یار اکٹھے ہیں۔ کوئی خطرہ نہیں کہ کوئی نامانوس مخلوق یہاں آئے اور ہماری محفل میں کھنڈت ڈالے۔ سو ادب' تجریدی آرٹ' فلسفہ' کسی بھی موضوع پر اطمینان سے بحث ہو سکتی ہے۔ شیخ صاحب شروع ہیں۔ اور یہ طے ہے کہ وہ اب لمبے چلیں گے۔ ناصر اطمینان کے ساتھ آنکھیں موندتا ہے اور تھوڑی ہی دیر میں خراٹے لینے لگتا ہے۔ شیخ صاحب بدستور جاری ہیں۔ انہیں سو فی صد یقین ہے کہ ناصر بیشک سو رہا ہو مگر ان کی بات سن رہا ہے۔ اور ناصر نے شیخ صاحب کے اس یقین کو کبھی ٹھیس نہیں پہنچائی۔ جب پوری نیند لے لیتا تو ان کا آخری فقرہ پکڑ لیتا اور اس حوالے سے تھوڑا تبصرہ کر کے باتھ روم چلا جاتا۔ وہاں ہاتھ منہ دھوتا۔ پھر واپس آ کر چائے

کا نیا آرڈر دیتا اور بحث میں سرگرمی سے شامل ہو جاتا۔

ایسی فضا میں ناصر کی شادی کا سوال جو اچانک اٹھ کھڑا ہوا تو ہم سب ہی کو عجیب نظر آتا تھا۔ گھر در سے بے نیاز شاعر اور شادی' کیا یہ انمل نہیں تھی۔ مگر ناصر کو اس انمل کا کوئی احساس نہیں تھا۔ وہ شادی کے سلسلہ میں سنجیدہ ہوتا چلا جا رہا تھا۔ اگرچہ ہمیں کتنے دنوں تک یہی گمان رہا کہ یہ بھی ناصر کے تخیل کی گونا گوں اڑانوں میں سے ایک اڑان ہے۔ رفتہ رفتہ وہ منزل آئی کہ براتیوں اور ولیمہ کے مدعوین کی فہرستیں بننے لگیں۔ روز کسی نہ کسی بہانے ناصر یہ ذکر چھیڑتا اور پھر مشتاق پنسل کاغذ سامنے رکھ کر مستعد ہو جاتا۔ جب سارے عمائدین شہر کے نام لکھے جا چکے ہوتے تو ناصر کہتا کہ یار غلام محمد کا بھی نام لکھ لو۔

''غلام محمد۔ کون غلام محمد۔''

''یار اپنا وہ گورنر جنرل۔''

''اچھا۔ مشتاق سر کھجانے لگتا۔

خیر یہ نام بھی لکھا جاتا۔ نام تو پتہ نہیں کس کس کے لکھے گئے۔ یہ ساری فہرستیں تو مشتاق کی جیب ہی میں لکھی رہ گئیں۔ ہم مشتاق اور اس کی جیب میں لکھی ہوئی فہرستوں کو چھوڑ کر ہی برات لے کر چل پڑے۔ بوجھو کیسے۔ رات گئے جب دوست اپنے اپنے گھروں کو ہو لیے اور ٹولنٹن مارکیٹ کے نکڑ پر پہنچ کر میں بھی رخصت ہونے لگا تو ناصر نے برآمدے میں بیٹھے پنواڑی سے لے کر ایک پان کھایا پھر مجھ سے کہا'' یار کل دوپہر کو آ جانا۔ یہی کوئی دو بجے۔ کافی ہاؤس پہنچ جانا۔ منٹگمری چلنا ہے۔''

''اچھا؟ کس سلسلہ میں؟''

''وہ ذرا میری شادی وادی کا قصہ ہے۔''

کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ اس اطلاع اور اس بلاوے پر اعتبار کروں یا نہ کروں۔ اگلا دن اتوار کا تھا۔ دفتر جانا نہیں تھا۔ دوپہر کو میں نے تھوڑے تذبذب کے بعد طے کیا کہ کوئی مضائقہ نہیں' چلتے ہیں۔ منٹگمری نہیں بھی جائیں گے تو کیا فرق پڑتا ہے۔ کافی ہاؤس میں نشست کریں گے۔ بیگ میں ایک جوڑا کپڑوں کا رکھ کر چل پڑا۔

اتوار کا دن' دوپہر کا وقت' کافی ہاؤس میں خاموشی تھی۔ اکا دکا کافی کا رسیا بیٹھا تھا۔ خالی ٹیبلوں سے نظر گزرتی ہوئی ایک گوشے میں گئی جہاں شیخ صاحب اور شاہد حمید بیٹھے تھے۔ اطمینان ہوا کہ کوئی تو ہے۔

''باقی براتی کہاں ہیں۔'' میں نے پوچھا۔

''ناصر سے پوچھو۔'' شیخ صاحب نے کھرتل لہجہ میں جواب دیا۔

''ناصر کہاں ہے۔''

''ہوگا یہیں کہیں' آ جائے گا۔'' وہی کھرتل لہجہ۔

میں ابھی بیٹھا ہی تھا کہ ناصر کا بھائی انصر گھبرایا گھبرایا آیا ''بھائی جان کہاں ہیں؟''

''ہمیں کیا پتہ۔ ہم تو خود اس کا انتظار کر رہے ہیں۔''

چپ ہوا۔ پھر تذبذب کے بعد فوراً بولا ''باقی لوگ کہاں ہیں۔''

''کون لوگ؟'' شیخ صاحب نے اپنے اسی لہجہ میں جواب دیا۔

''جنہیں برات میں چلنا ہے۔'' ''ناصر جانے۔ ہمیں کیا پتہ۔''

مذبذب کھڑا رہا۔ ''اچھا میں بھائی جان کو چل کر دیکھتا ہوں۔ مگر آپ تو پہنچئے۔ روانگی میں پہلے ہی دیر ہو چکی ہے۔''

ہم اٹھ کھڑے ہوئے۔ اخیر انصر نے ناصر کو جلد ہی برآمد کر لیا۔ ٹولنٹن کے نکڑ پر بیٹھے پنواڑی کے ساتھ گپ شپ میں مصروف پکڑا گیا۔ جب ناصر ٹی ہاؤس میں نہ ہوتا اور کافی ہاؤس اور چائنیز میں بھی سراغ نہ ملتا تو یہ بات طے ہوتی کہ شہر کے کسی نکڑ پر کسی پنواڑی سے محو گفتگو ہے یا باغ جناح کی طرف نکل گیا ہے۔ مال روڈ اور قریب و دور کے فٹ پاتھوں پر بیٹھے ہوئے سب ہی پنواڑیوں سے ناصر کے دوستانہ مراسم تھے۔ سب کے ساتھ حساب چلتا تھا۔ بعض کے ساتھ حساب دوستاں در دل والا معاملہ تھا۔ تو خیر ذکر یہ تھا کہ ناصر کو پنواڑی کی دکان سے پکڑ کر لایا گیا اور جلدی جلدی چوٹی سہرے کی رسم ادا کی گئی۔ برات چلنے کے لیے تیار کھڑی تھی۔

کافی ہاؤس سے نکل کر میں نے ٹی ہاؤس کی طرف نظر ڈالی تو دیکھا کہ صفدر میر نے سائیکل سے اتر کر سائیکل سٹینڈ پر سائیکل کھڑی کی ہے۔ میں لپک کر وہاں پہنچا ''صفدر صاحب' آج آپ بہت جلدی آ گئے۔''

''ہاں یار حلقہ کے جلسہ میں ایک دوست کا مضمون سننا ہے۔''

''حلقہ کا جلسہ ضروری ہے یا ناصر کی شادی۔''

''ناصر کی شادی؟ کیا مطلب؟''

''مطلب یہ کہ ناصر کی شادی ہو رہی ہے۔ برات منٹگمری جانے کے لیے تیار کھڑی ہے۔''

''ناصر کی شادی۔'' صفدر نے قہقہہ لگایا ''بکواس مت کرو۔''

''واقعی شادی ہے۔ہم وہاں جارہے ہیں۔آپ بھی چلیں۔''

''میں؟''صفدر نے پھر قہقہہ لگایا۔

میں نے بہت مشکل سے صفدر کو قائل کیا کہ یہ معاملہ بہت سنجیدہ ہے۔ناصر نے لاابالی پن میں دوستوں کو اس اطلاع بھی نہیں دی ہے۔مگر چند براتی تو ہونے چاہئیں۔آپ ہمارے ساتھ چلیں۔''

صفدر نے تھوڑی دیر سوچا۔پھر کہا'اس سائیکل کا کیا کروں۔''

''بیدل جالندھری کے حوالے کریں۔وہ رات کوٹی ہاؤس میں کھڑی کردے گا۔کل تو ہم آ ہی جائیں گے۔

تو لیجئے ایک براتی اور شامل ہوگیا۔باقی ناصر کے ایک بڑے بھائی' چھوٹا بھائی انصر اور ایک اور بزرگ تھے۔خواجہ صاحب۔ خواتین میں ناصر کی بھابھی۔یہ تھی برات۔اس برات کے ساتھ ہم منٹگمری پہنچے۔وہاں دیکھا کہ ڈیرے تنبو تنے ہوئے ہیں۔کرسیاں قطار اندر قطار بچھی ہوئی ہیں۔استقبال کرنے والے گجرے ہاتھوں میں لیے کھڑے ہیں۔براتی کل ملا کر اٹھ نگ۔ادھر گجرے وافر۔

رات گزر رہی تھی۔نکاح اب ہوتا ہے نہ تب ہوتا ہے۔شرائط ہی طے ہونے میں نہیں آ رہے تھے۔اصل میں دلہن والے بہت فکرمند تھے کہ لڑکا تو شاعر ہے'لاابالی ہے۔ان کی بیٹی کی زندگی کیسے گزرے گی۔سوانہوں نے کچھ کڑی شرطیں رکھی تھیں۔شرطوں کا کاغذ ناصر کے سامنے آیا۔اور یکا یک ہم نے دیکھا کہ ناصر نے سہرے کی لڑیوں کو چہرے سے تھوڑا ہٹایا اور تقریر شروع کردی کہ لفظ کیا ہوتے ہیں'ایک ایک لفظ میں کتنے معنی پنہاں ہوتے ہیں۔اصل میں بزرگوں نے اسے دلاسا دیا تھا۔یہ رسمی تحریر ہے۔ان لفظوں کے وہ معنی نہیں ہیں جو تم سمجھ رہے ہو۔بس دستخط کردو۔ناصر کو تاؤ آیا۔آپ مجھے لفظوں کے معنی بتائیں گے۔لفظ تو میری انگلیوں میں کھیلتے ہیں۔میں جانتا ہوں کہ جو لفظ ہمیں سادہ نظر آتے ہیں ان کی تہہ میں کیا کچھ ہوتا ہے اور اس رو میں ناصر بولتا چلا گیا۔اور یکا یک اسے خیال آیا کہ اس کے ساتھ جو بزرگ آئے ہیں انہوں نے یہ شرطیں مان کو کوئی اچھی بات نہیں کی۔''آج اگر میرا باپ زندہ ہوتا۔'' اور یہ کہتے ہوئے ناصر کی آواز بھرا گئی۔اس پر رقت طاری ہوگئی۔بزرگوں نے بڑھ کر ناصر کو سنبھالا۔تھوتھمبو کی اور فوراً ہی صیغہ شروع ہوگیا۔

خیر یہ قصے قضیے تو شادی بیاہ کی روایت کا حصہ ہیں۔ہر بیاہ شادی میں ایسا کوئی رپھڑ ضرور پڑتا ہے۔پھر بڑے بوڑھے بیچ میں پڑ کر معاملہ طے بھی کرا دیتے ہیں۔یہاں بھی یہی ہوا۔تو لو یار وشاعر کی شادی ہوگئی۔ہم دلہن کو لے کر دوسرے دن بخیریت واپس آئے۔ناصر کو دلہن کے ساتھ گھر چھوڑا۔رات ہو رہی تھی۔سوچا کہ چائنیز میں چل کر دم لیں' چائے پئیں۔وہاں جا کر بیٹھے۔چائے کا

آرڈر دیا۔ نظر اٹھا کر جو دیکھا تو کیا دیکھا کہ ایک گوشے میں مشتاق اکیلا بیٹھا چائے پی رہا ہے اور غضبناک نظروں سے ہماری طرف دیکھ رہا ہے۔ ہمارا حال کہ کاٹو تو بدن میں لہو نہیں۔ ہم میں سے کسی میں یہ ہمت نہیں ہوئی کہ اسے پکار کر بلائے کہ آؤ چائے پیو۔ اس نے غصیلی آواز میں بیرے کو پکارا۔ بل ادا کیا۔ اور تیزی سے باہر نکل گیا۔

ناصر کی شادی کی خبر یار و اغیار میں جنگل کی آگ کی طرح پھیلی۔ جس نے سنا پہلے حیران ہوا' پھر افسردہ ہوا۔ پھر اسے ناصر پر غصہ آیا۔ ناصر نے اپنے سارے ہی مداحوں کے ساتھ بہت بڑی دغا کی تھی۔ ناصر صرف شاعری نہیں کر رہا تھا۔ اپنی شاعری کو بسر بھی کر رہا تھا۔ مداحوں کے تصور میں شاعر اور اس کی شاعری آپس میں گھل مل کر ایک چیز بن گئے تھے۔

اتنی ہمت نہیں کہ گھر جائیں
خاک ہو کر یہیں بکھر جائیں

میں ہوں رات کا ایک بجا ہے
خالی رستہ بھول رہا ہے

شام سے سوچ رہا ہوں ناصر
چاند کس شہر میں اترا ہوگا

منہ اندھیرے ہی ناصر کسے ڈھونڈنے چل دیئے
دور ہے صبح روشن ابھی سو رہو سو رہو

یہ شاعری بھی تھی اور مداحوں کے حساب آپ بیتی بھی تھی۔ ایسے رومانی کردار کے ساتھ شادی خانہ آبادی کا تصور لگا نہیں کھاتا۔ یہ شاعرانہ کردار مداحوں کی جذباتی ضرورتوں کو پورا کرتا تھا۔ اچانک شادی کی خبر نے اس سارے رومان کو ملیامیٹ کر دیا۔ مداحوں کو غصہ آنا ہی تھا۔ اچانک ایک مداح نے کافی ہاؤس میں بیٹھے بیٹھے اعلان کیا کہ ناصر مر گیا۔"

"کیا بکواس کرتے ہو۔"

"ناصر جو شاعر تھا وہ تو مر گیا۔ اب اس طرف سے کوئی غزل نہیں آئے گی۔"

مایوس مداحوں کو فوراً ہی اس بات کا یقین آ گیا۔ اب جسے دیکھو کہہ رہا ہے کہ یار شاعر مر گیا۔ اب ناصر شعر نہیں کہہ سکتا۔

ناصر کا ان دنوں کافی ہاؤس میں آنا جانا بھی کم ہو گیا تھا۔ ہم جان کر اس کی طرف نہیں جاتے تھے کہ اس کے ہنی مون میں کھنڈت نہیں پڑنی چاہیے۔

مگر اسی ہنگام جب شاعر کے مرنے کا چرچا ہو رہا تھا اچانک وہ ایک شام ٹی ہاؤس میں داخل ہوا اور مژدہ سنایا کہ غزل ہوئی ہے۔

کچھ تو احساس زیاں تھا پہلے
دل کا یہ حال کہاں تھا پہلے

ایک دم سے یار و اغیار سب کے منہ بند ہو گئے۔ شاعر کی بحالی ہو گئی۔

مگر شاعری اپنی جگہ اور زندگی کی حقیقتیں اپنی جگہ۔ اور زندگی کی حقیقتوں کا تو ناصر کو اب پتہ چلنا شروع ہوا تھا۔ پہلے اس نے کب سوچا ہو گا کہ ازدواجی زندگی شاعرانہ زندگی سے کتنی مختلف ہوتی ہے اور کیا کیا اس کے تقاضے اس کے روگ ہوتے ہیں۔ مگر شادی کے بعد بھی یہ سوچنا اس کے دوستوں مداحوں اور کرم فرماؤں کی ذمہ داری تھی۔ سو یوں ہوا کہ شادی کے فوراً بعد حفیظ ہوشیار پوری بہت متحرک ہو گئے۔ انہیں فکر تھی کہ اب ناصر کے لیے کسی ملازمت کا جلدی سے بندوبست ہونا چاہیے۔ ان کی کوششیں بار آور ہوئیں۔ میاں بشیر احمد کے ''ہمایوں'' کو اس وقت ایک ایڈیٹر کی ضرورت تھی۔ اس ضرورت کو ناصر نے پورا کیا۔

اور مکان؟ اس محاذ پر ایک دوسرا دوست یا مداح جو بھی کہو سرگرم پایا گیا۔ یہ عبدالعلیم تھے جو محبوب خزاں کے توسط سے ناصر سے ملے اور اس کے گرویدہ ہو گئے۔ انہوں نے اپنے افسر والے رسوخ سے کام لے کر کرشن نگر میں ایک اچھا خاصا بڑا گھر ناصر کے نام الاٹ کرا دیا۔ لیجیے بے خانماں شاعر کی سچ مچ خانہ آبادی ہو گئی۔ اور کبوتر پھر آتے ہی چلے گئے۔ ناصر کی ازدواجی زندگی اور کبوتر بازی کی زندگی کا آغاز بس آگے پیچھے ہوا۔

رتجگوں کا وہ دور جب چڑیوں کی پہلی چہکار کے ساتھ گھروں کو واپسی ہوا کرتی تھی تمام ہوا۔ رتجگے جب وقفہ کے بعد دوبارہ شروع ہوئے تو ان میں قدرے اعتدال آ گیا تھا۔ اب ناصر کے لیے رات کے کسی نہ کسی پہر میں واپسی ضروری ہو گئی۔ یہ واپسی کیسے ہوتی تھی، یہ بھی سناؤں گا۔ فی الحال تو یہ یاد کرنے کی کوشش کر رہا ہوں کہ شادی کی وجہ سے جو وقفہ آیا تھا وہ کیسے ٹوٹا اور جب دوبارہ محفل گرم ہوئی تو اس کا کیا رنگ تھا۔

ہاں اس محفل میں ایک چہرہ اور نظر آنے لگا تھا۔

حفیظ ہوشیار پوری ٹرانسفر ہو کر لاہور آ گئے تھے، لاہور کے ریڈیو سٹیشن کے ڈائریکٹر کی حیثیت سے۔ لیجیے ناصر کے چاہنے والوں